چندو لال: ''واہ میرے شیر! یہ مردوں کی سی باتیں ہیں، تو ہم لوگ بن ٹھن کر آ جائیں کیوں؟''

کملا: ''جی ذرا منہ پر کالکھ لگا لیجئے گا، بس اتنا ہی کافی ہے''

سعید: ''تو کار خیر میں تاخیر کیوں ہو؟ آج ہی کی ٹھہری نا؟''

کملا: ''آج ہی سہی، مگر یاد رہے کہ کل آپ سب اصحاب کی بیویوں کے درشن کروں گا، اس وقت اگر کسی نے چیں چپڑ کیا تو بندہ کا پوپش مبارک اور اس کا فرق نا مبارک''

سب کے سب ''منظور بہ دل و جان منظور''

رام سیوک: ''یہاں کیا دھرا ہے، پانچ بچوں کی ماں اور اس پر پھٹے حال، خاصی چڑیل معلوم ہوتی ہے''

چندو لال: ''یہاں اس سے بھی بدتر حال ہے، تین مہینے سے چوتھیا آ رہا ہے مگر کس مردود نے کوڑی کی دوا لی ہو، صورت دیکھتے ہی بخار چڑھ جاتا ہے''

سعید: ''ایں جانب یہ روگ ہی نہیں پالتے، چند روزہ انتظام مستقل انتظام سے بہتر ہوتا ہے''

ادھر تو مئے ناب کے دور چل رہے تھے اور ادھر برجن پلنگ پر لیٹی ہوئی خیالوں میں غرق تھی، بچپن کے دن کیسے اچھے ہوتے ہیں، کاش! وہ دن پھر آ جاتے۔ آہ! کیسی دلچسپ زندگی تھی، دنیا ناز، پیار اور محبت کا گہوارہ تھی، کیا وہ کوئی دوسری دنیا تھی، کیا ان دنوں کی چیزیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ انہی خیالوں میں آنکھ ذرا جھپک گئی اور بچپن کا ایک واقعہ پیش نظر ہو گیا۔ للو نے اس کی گڑیا مروڑ دی۔ اس نے اس کی کتاب کے دو ورق پھاڑ ڈالے، تب للو نے اس کی پیٹھ میں زور سے چٹکی لی اور باہر بھاگا، وہ رونے لگی اور للو کو کوس رہی تھی کہ سباما اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی اور بولی۔

''کیوں بیٹی! اس نے تمہیں مارا ہے نا؟ یہ بہت مار مار کر بھاگتا ہے، آج اس کی مرمت کرتی ہوں، دیکھوں کہاں مارا ہے''

للو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا اور برجن نے مسکرا کر کہا

''مجھے انہوں نے کہاں مارا، یہ مجھے کبھی نہیں مارتے''

یہ کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اپنے حصہ کی مٹھائی کھلائی اور پھر دونوں مل کر کھیلنے لگے، وہ زمانہ اب کہاں؟ اس زمانہ کی یاد ایک خواب حسرت کی یاد ہے۔

رات زیادہ گزر گئی تھی۔ یکایک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ سامنے والی دیوار کوئی دھمدھما رہا ہے۔ اس نے کان لگا کر سنا، برابر آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی رک جاتیں کبھی پھر آنے لگتیں، ذرا دیر میں مٹی گرنے لگی۔ خوف کے مارے برجن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے مہراجن کو جھنجھوڑنے لگی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں مٹی کا ڈھیلا سامنے گرا اور مہراجن چونک کر اٹھ بیٹھی، دونوں کو یقین ہو گیا کہ چور آئے ہیں، مہراجن ایک چالاک عورت تھی، سمجھی کہ چلاؤں گی تو جاگ ہو جائے گی، اس نے سن رکھا تھا کہ چور سیند میں پیر ڈال کر گھستے ہیں، اس نے ایک ڈنڈا اٹھا لیا کہ جب پیر ڈالے گا تو ایسا تاک کر ماروں گی کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی، مگر چور نے پیر کے بجائے سیند میں سر ڈالا۔ مہراجن تاک میں تو تھی ہی ڈنڈا چلا دیا اور کھٹ کی آواز آئی، چور نے سر کھینچ لیا اور یہ کہتا سنائی دیا'' اف مار ڈالا کھوپڑی بھنا گئی''

پھر کئی آدمیوں کے ہنسنے کی آواز آئی اور اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ جاگ پڑے اور باقی رات گپ شپ میں کٹی۔

سویرے جب کملا چرن گھر میں آئے تو آنکھیں سرخ تھیں اور سر میں آماس تھا۔ مہراجن نے نزدیک جا کر دیکھا اور آ کر برجن سے بولی۔

''بہو ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟''

برجن: ''برا کیوں مانوں گی، کہو کیا کہتی ہو؟''

مہراجن: ''رات جو سیندھ پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی''

برجن: ''پھر کون تھے؟''

مہراجن: ''گھر ہی کے بھیدی تھے، باہر کا کوئی نہیں تھا''

برجن: ''کیا کسی کہار کی شرارت تھی؟''

مہراجن: ''نہیں کہاروں میں ایسا کوئی نہیں ہے''

برجن: ''پھر کون تھا، صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟''

مہراجن: ''میرے دھیان میں تو چھوٹے بابو تھے، میں نے وہ لکڑی دے پھینکی تھی، وہ ان کے سر میں لگی، سر پھولا ہوا ہے''

اتنا سننے ہی برجن کے تیور بدل گئے اور چہرہ تمتما گیا، غضبناک ہو کر بولی

''مہراجن! ہوش سنبھال کر باتیں کرو، تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہیں ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا؟ خود میرے سر پر الزام تھوپ رہی ہو۔ تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے، ورنہ اسی وقت تمہیں یہاں سے کھڑے کھڑے نکلوا دیتی۔ تب تمہیں معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہ پھل ہوتا ہے یہاں سے اٹھ جاؤ، مجھے تمہاری صورت دیکھ کر بخار سا چڑھ آتا ہے، تمہیں اتنا نہ سمجھ پڑا کہ میں کیسی بات زبان سے نکال رہی ہوں۔ انہیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے، سارا گھر ان کا ہے، میں خود ان کی چیری ہوں اور ان کی نسبت سے تم ایسی باتیں کہہ بیٹھیں''

مگر جس بات پر برجن ایسی برہم ہوئی اسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیوں کو آسانی سے یقین آ گیا

ڈپٹی صاحب کے کان میں بات پہنچی، وہ کملا چرن کو اس سے زیادہ شریر النفس سمجھتے تھے جتنا وہ فی الواقع تھے، خوف ہوا کہ یہ حضرت کہیں بہو کے زیوروں پر نہ ہاتھ صاف کریں، بہتر ہو کہ انہیں بورڈنگ ہاؤس بھیج دوں

کملا چرن نے یہ تجویز سنی تو بہت چیخے چلائے، مگر کچھ سوچ کر دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس چلے گئے۔

برجن کے آنے سے پہلے کئی بار یہ تجویز ہوئی تھی مگر کملا کی ضد کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی۔ یہ بیوی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف تھا جو اب کی بار اسے بورڈنگ ہاؤس لے گیا۔

13

کایا پلٹ

پہلا دن تو کملا چرن نے کسی طرح بورڈنگ ہاؤس میں کاٹا صبح سے شام تک پڑے سویا کی۔ دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو نواب صاحب اور تیکھے مرزا کے بٹیروں میں بدا ہوا جوڑ ہے، کیسے کیسے مست پٹھے ہیں کہ دیکھ کر روح وجد کرنے لگے۔ آج ان کی پکڑ دیکھنے کے قابل ہوگی۔ شہر کا شہر پھٹ پڑے تو عجیب نہیں، چہ خوش، شہر کے لوگ تو بہار اڑائیں اور میں یہاں کتابوں سے سر کھپاؤں۔

یہ سوچتے سوچتے اٹھا اور دم کی دم میں بدان کے موقع پر تھا

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی۔ خاصا میلہ لگا ہوا تھا، ستے چھڑکاؤ کر رہے تھے، سگریٹ والے، کباب والے، تمبولی سب اپنی اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے اور شہر کے رنگین مزاج نوجوان ہاتھوں میں بٹیر لیے یا مخملی اڈوں پر بلبلوں کو بٹھائے مٹر گشت کر رہے تھے۔ کملا چرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کمی، لوگ انہیں خالی دیکھتے تو حیرت سے پوچھے ارے راجہ صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے، اتنے میں میاں سعید، مجید، حمید وغیرہ نشہ میں چور سگریٹ کے دھوئیں بھکا بھک اڑاتے نظر آئے۔ کملا چرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سرپٹ دوڑے اور پانچ کے پانچوں عیوب شرعی کی طرح ان سے لپٹ گئے۔

مجید: ''آج تم کہاں غائب ہو گئے تھے میاں؟ قرآن کی قسم مکان کے سینکڑوں

چکر لگائے ہوں گے"

رام سیوک: "آج کل عید کی راتیں ہیں بھئی، آنکھیں نہیں دیکھتے نشہ سا چڑھا ہوا ہے"

چندولال: "چین کر رہا ہے پٹھا، جب سے نازنین گھر میں آئی ہے اس مرد خدا نے بازار کی صورت تک نہیں دیکھی جب دیکھئے گھر میں گھسا رہتا ہے خوب چین کر لے یار، دوستوں کی طرف سے بھی بوسے لے لیا کرو"

کملا: "چین کیا کروں، یہاں تو قید میں پھنس گیا، تین دن سے بورڈنگ میں پڑا ہوں"

مجید: "ارے! خدا کی قسم"

کملا: "تیری جان کی قسم! پرسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے، آض سبھوں کی آنکھیں بچا کر نکل بھاگا"

رام سیوک: "اف! مصیبت ہی مصیبت ہے، مگر یار خوب اڑے، وہ مچھندر سپرنٹنڈنٹ جھلا رہا ہوگا"

کملا: "اس معرکہ کے جوڑ چھوڑ کر کتابوں میں سر کون مارتا، اس کی مدتوں سے آرزو تھی"

سعید: "یار آج اڑ آئے تو کیا، حق یہ ہے کہ تمہارا وہاں رہنا ستم ہے، روز تو نہ آسکو گے اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں، نئی نئی دلچسپیاں، کل لال ڈگی پر، پرسوں پریڈ پر، ترسوں بٹیرے کا میلہ، کہاں تک گناؤں"

سعید: "اور بٹیروں کا میلہ نہ دیکھا تو حسرت رہ جائے گی"

سہ پہر کے وقت کملا چرن یاران شاطر سے رخصت ہو کر با دل ناخواستہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ دل میں ایک چودسا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر جھانکنے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نہ ہوں تو لٹک کر کمرہ میں چلا جاؤں، مگر دیکھتا ہے کہ وہ بھی باہر

کی طرف آ رہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کر کے اندر داخل ہوا، سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے ''اب تک کہاں تھے؟''

لہجہ ایسا درشت تھا کہ کملا چرن بہ مشکل ترکی بہ ترکی جواب دینے سے باز رہا مغرورانہ انداز سے بولا ''ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا''

سپرنٹنڈنٹ: ''یہ بازار جانے کا وقت نہیں ہے''

کملا: ''مجھے معلوم نہ تھا آئندہ سے احتیاط رکھوں گا''

رات کو جب کملا چارپائی پر لیٹا تو سوچنے لگا یار آج تو بچ گیا۔ مگر مزہ تو تب ہے کہ کل بھی بچوں اور پرسوں بھی حضرت کی آنکھوں میں دھول ڈالوں، کل کا نظارہ واقعی قابل دید ہوگا۔ کنکوے آسمان سے باتیں کریں گے۔ اور لمبے لمبے پیچ ہوں گے، نوشہ مرزا بلا کی بازی لگاتا ہے، یہ خیال کرتے کرتے سو گیا۔ دوسرے دن پھر علی الصبح بورڈنگ ہاؤس سے نکل بھاگا۔ یاران دل نواز دل ڈگی پر اس کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور پیٹھ ٹھوکی

کملا چرن کچھ دیر تک تو کٹاؤ دیکھتا رہا۔ پھر شوق چرایا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے کنکوے منگواؤں اور اپنی تیز دستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے بھڑکایا کہ بد بد کر لڑاؤ۔ روپیہ ہم دیں گے، چٹ آؤ دیکھا نہ تاؤ، مکان پر آدمی دوڑا دیا، کامل یقین تھا کہ اپنے مانجھے سے یہاں ستھراؤ کر دوں گا، مگر آدمی گھر سے خالی ہاتھ لوٹا، تب تو حضرت کو تاب نہ رہی، بدن میں آگ سی لگ گئی، ہنٹر لے کر دوڑے اور مکان پر آتے ہی کہاروں کو ایک طرف سے سڑ سڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ غریب بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہنٹر پڑے اور بے خطا بے قصور تو چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ اور سارے محلے میں ایک شور سا برپا ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہماری خطا کیا ہے۔ یہاں کہاروں کی خاطر خواہ مرمت کر کے کملا چرن اپنے کمرے میں پہنچے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھ کر غصہ بخار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ پتنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں

ٹوٹی ہوئیں اور مانجھے کی لچھیاں الجھی ہوئیں، گویا کسی وبا نے ان ہوائی جنگ آوروں کا ستیاناس کر دیا ہو، سمجھ گئے کہ ضرور اماں نے یہ حرکت کی ہے، غصہ سے لال اماں کے پاس آئے اور زور زور سے کہنے لگے

''کیوں اماں! کیا سچ مچ میری جان ہی لینے پر آ گئی ہو، تین دن ہوئے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی کے جو سامان تھے وہ سب برباد کر ڈالے، کیوں؟''

پریم وتی: (حیرت میں پڑ کر) ''میں نے تمہاری کوئی چیز نہیں چھوئی کیا ہوا؟''

کملا: (بگڑ کر) ''جھوٹوں کے منہ میں کیڑے پڑتے ہیں، اگر تم نے میری چیزیں نہیں چھوئیں تو کس کی مجال ہے جو میرے کمرے میں جا کر میرے کھلونے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑ ڈالے، کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جا سکتا؟''

پریم وتی: ''تمہارے سر کی قسم! میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا، چلو دیکھو کون کونسی چیزیں ٹوٹی ہیں؟''

یہ کہہ کر پریم وتی تو اس کمرہ کی طرف چلی اور کملا غصہ میں بھرے آنگن میں کھڑے رہے کہ اتنے میں مادھوتی برجن کے کمرے سے نکلی اور ان کے ہاتھ میں ایک رقعہ دے کر چلی گئی لکھا ہوا تھا۔

خطا میں نے کی ہے خطاوار ہوں

سزا دیجیے جو سزا وار ہوں

یہ پرزہ دیکھتے ہی کملا بھیگی بلی بن گیا۔ دبے پاؤں مردانے کی طرف چلا۔ پریم وتی نے پردے کی آڑ سے سسکتے ہوئے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا تھا۔ اسے منع کیا اور اسی وقت چند اور کنکوے جو بچے ہوئے تھے پھاڑ ڈالے، چرخیاں ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور ڈور میں دیا سلائی لگا دی۔ ماں اس کی یہ مجنونانہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا معاملہ ہے، کہاں تو ابھی ابھی انہیں چیزوں کے لیے دنیا سر پر

اٹھائی اور کہاں خود ہی ان کے پیچھے پڑ گیا سمجھی شاید مارے غصے کے یہ حرکت کر رہا ہے۔ مگر کملا کے چہرے سے غصہ مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔

''میں غصہ میں نہیں ہوں، آج سے پکا ارادہ کرتا ہوں کہ پتنگ کبھی نہ اڑاؤں گا، میری حماقت تھی کہ ان چیزوں کے لیے آپ سے جھگڑ بیٹھا''

جب کملا چرن کمرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا۔ بے شک میرے کنکوے اڑانا انہیں ناپسند ہے۔ دل سے نفرت کرتی ہیں ورنہ مجھ پر یہ ظلم ہرگز نہ ہوتا۔ کاش ایک بار ان سے ملاقات ہو جاتی تو پوچھتا کہ تمہاری مرضی کیا ہے۔ ایک تو کوڑھ مغز اس پر اپنی حماقت کے کئی ثبوت دے چکے ہیں۔ سیندوالے معاملے کی خبر انہیں ضرور ہوئی ہو گی۔ انہیں صورت دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب تو یہی علاج ہے یا تو ان کی صورت نہ دیکھوں اور نہ اپنی دکھاؤں یا کسی طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہائے! ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔ عورت نہیں حور معلوم ہوتی ہے، کیا کبھی وہ دن بھی ہوں گے کہ میں اسے پیار کروں گا اور میرے پیار کے بدلے وہ مجھ سے پیار کرے گی۔ اس وقت تک شاید میں شادی مرگ ہو جاؤں۔ کیا سرخ سرخ رسیلے ہونٹ ہیں، مگر ظالم ہے رحم تو اسے چھو نہیں گیا ہے۔ کہتی ہے سزا دیجئے جو سزاوار ہوں۔ کیا سزا دوں اگر آ جاؤ تو گلے سے لگا لوں اور ان گنت بوسے لوں۔ یہی تمہاری سزا ہے اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا دوں گا ضرور، اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہئے۔ یہ سوچتے سوچتے اٹھا اور ڈربہ کھول کر کبوتروں کو اڑانے لگا۔ سینکڑوں ہی جوڑے تھے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ آسمان میں تارے بن کر جائیں اڑیں تو دن بھر اترنے کا نام نہ لیں۔ شہر کے کبوتر باز ایک جوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر چشم زدن میں سب کے سب اڑا دیئے۔ جب ڈربہ صاف ہو گیا تو کہاروں کو یہ حکم دیا کہ اسے اٹھا لے جاؤ اور آگ میں جلا دو ورنہ سب کبوتر اس پر آ بیٹھیں گے۔ کبوتروں کا قصہ پاک کر کے بٹیروں اور بلبلوں کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور انہیں

بھی بند قفس سے آزاد کر دیا۔

باہر تو یہ گل کھلا ہوا تھا اور اندر پریم وتی چھاتی پیٹ رہی تھی کہ نہیں معلوم لڑکا کیا کرنے پر آ گیا ہے برجن کو بلا کر کہا

''بیٹی! بچے کو کسی طرح روکو، نہیں معلوم اس نے دل میں کیا ٹھانی ہے'' یہ کہہ کر رونے لگی۔ برجن کو بھی شک ہو رہا تھا کہ ضرور انہوں نے کچھ اور نیت کی ہے ورنہ اس جھلاہٹ کے کیا معنی؟ گو کملا بد شوق تھا۔ بد اخلاق تھا، آوارہ تھا، مگر ان سب عیبوں کے ساتھ اس میں ایک بڑا وصف تھا جس کی کوئی عوت نا قدرہ نہیں کر سکتی۔ اسے برج رانی سے سچی محبت تھی اور اس کا نادانستہ طور پر کئی بار اظہار ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا جس نے برجن کو اتنا دلیر بنا دیا تھا۔ اس نے کاغذ نکالا اور یہ پرزہ لکھ کر باہر بھیجا

''پیارے! یہ خفگی کس پر ہے؟ کیا مجھ پر اور محض اس لیے کہ میں نے عجلت کر کے دو تین کنکوے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے برگشتہ ہو جائیں گے تو ہرگز انہیں ہاتھ نہ لگائی مگر اب معاف فرمائیے۔ یہ پہلی خطا ہے''

آپ کی

برج رانی

کملا چرن یہ خط پا کر ایسا خوش ہوا گویا ساری دنیا کی دولت ہاتھ لگ گئی۔ جواب دینے کا شوق چرایا۔ مگر قلم ہی نہیں اٹھتا۔ نہ القاب ملتا ہے نہ آداب، نہ اٹھان کا خیال ہوتا ہے، نہ خاتمہ کا، ہر چند چاہتا ہے کہ کوئی عاشقانہ رنگ کا پھڑکتا ہوا خط لکھوں، مگر عقل ذرا بھی نہیں دوڑتی، آج پہلی بار کملا چرن کو اپنی بے علمی اور جہالت پر رونا آ گیا۔ افسوس! میں ایک سیدھا سا خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس خیال سے وہ رونے لگا اور کمرہ کے دروازے بند کر لیے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

سہ پہر کے وقت منشی شیاما چرن گھر پر آئے تو سب سے پہلے جس چیز نظر پڑی وہ آگ کا الاؤ تھا۔ نوکروں سے متعجب ہو کر پوچھا۔

''یہ کیسا الاؤ ہے؟''

نوکروں نے جواب دیا ''حضور ڈربہ جل رہا ہے''

منشی جی (گھرک کر) ''اسے کیوں جلاتے ہو، کبوتر کہاں رہیں گے؟''

کہار: ''چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب ڈربے جلا دو''

منشی جی: ''کبوتر کہاں گئے؟''

کہار: ''سب اڑا دیئے ایک بھی نہ رکھا۔ کنکوے سب پھاڑ ڈالے، ڈور جلا دی، بڑا نکسان کیا''

کہار نے اپنی دانست میں مار پیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب سمجھا کہ منشی جی اس نقصان کے لیے کملا چرن کو سخت سست کہیں گے۔ مگر منشی جی نے یہ واقعہ سنا تو سکتے میں آ گئے۔ انہیں جانوروں پر کملا چرن جان دیتا تھا۔ آج یکا یک کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے، کہار سے کہا ''بچے کو بھیج دو''

ایک منٹ میں کہار نے آ کر کہا ''ہجور دروجا اندر سے بند ہے، بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں''

اتنا سننا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہو گیا۔ فوراً شبہ ہوا کہ بچہ نے زہر کھا لیا۔ آج ایک زہر خورانی کے مقدمہ کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ ننگے پاؤں دوڑے اور بند کمرہ کے دروازے پر زور سے لات مار کر کہا ''بچہ .....! بچہ .....!!''

یہ کہتے کہتے گلا پھنس گیا۔ کملا نے باپ کی آواز سنی تو فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ مگر اسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بجائے لعن طعن کرنے کے اسے سینے سے لگا لیا اور گھبرا کر پوچھا

''بچہ ....! تمہیں میرے سر کی قسم! بتا دو تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟''

کملا چرن نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کے لیے منشی جی کی طرف آنکھیں اٹھائیں تو ان میں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہو گیا ضرور آفت آ گئی، ایک کہار سے کہا

''ڈاکٹر صاحب کو بلا لا، کہنا ابھی چلیے''

اب جا کے کند ذہن کملا باپ کی اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا، دوڑ کر ان سے لپٹ گیا اور بولا۔

''آپ کا شبہ بالکل بے جا ہے آپ کے سر کی قسم! میں بالکل اچھا ہوں''

مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کرنا چاہتا ہے تا کہ اپنا کام تمام کر لے، منت کر کے بولے

''بچہ! ایشور کے لیے مجھے چھوڑ دو، میں صندوق سے ایک دوا لیتا آؤں، میں کیا جانتا تھا کہ تم اس نیت سے بورڈنگ ہاؤس جا رہے ہو''

کملا: ''بخدا! میں بالکل اچھا ہوں، آپ کا شبہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسا غیرت مند ہوتا تو آج ایسا جاہل تھوڑے ہی بنے رہتا۔ آپ خواہ مخواہ ڈاکٹر صاحب کو بلا رہے ہیں''

منشی جی: (کچھ کچھ یقین کر کے) ''کواڑ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟''

کملا: ''جی اندر سے ایک خط آ گیا تھا اس کا جواب لکھ رہا تھا''

منشی جی: ''اور یہ کبوتر وغیرہ کیوں اڑا دیئے؟''

کملا: ''اس لیے کہ خوب اطمینان سے پڑھوں۔ انہیں خرافات میں میرا وقت ضائع ہو جاتا تھا آج میں نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ اب آپ دیکھیں گے کہ میں کیسا جی لگاتا ہوں''

بارے ڈپٹی صاحب کے ہوش بجا ہوئے۔ اندر آ کر پریم وتی سے حال پوچھا تو اس نے ساری رامائن کہہ سنائی۔ انہوں نے جب سنا کہ برجن نے غصہ میں آ کر کملا

کے کنکوے پھاڑ ڈالے اور چرخیاں توڑ ڈالیں تو بے اختیار ہنس پڑے اور کملا کی دلچسپیوں کی خانہ بربادیوں کا راز سمجھ میں آ گیا بولے ''قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہو ان لالہ کو درست کر کے چھوڑے گی۔ آج کل دفتر سے آتا ہوں تو اکثر گھر پر ہی بیٹھے پاتا ہوں، کبھی کبھی کتاب بھی کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آ گئے حضرت بیوی کے پنجے میں، دیکھ لینا اب سنبھل جائیں گے''

14

بدگمانی

برج رانی کی رخصتی کے بعد سباما کا گھر ایسا سونا ہو گیا گویا قفس سے چڑیا اڑ گئی۔ وہ اس گھر کا اجالا اور جسم کی جان تھی۔ مکان وہی تھا مگر در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ مکین وہی تھے مگر سب کے چہرے افسردہ اور آنکھیں غمناک ہو رہی تھیں۔ گلشن وہی ہے مگر خزاں رسیدہ، رخصتی کے بعد مہینہ بھر کے اندر منشی سنجیون لال بھی تیرتھ جاترا کو سدھارے، مال و دولت جو کچھ تھا، پرتاپ کو سونپ دیا، اپنے ساتھ مرگ چھالا، بھگوت گیتا اور چند کتابوں کے سوا اور کچھ نہ لے گئے۔

پرتاپ چند پر زور محسوسات کا نوجوان تھا، مگر اس کے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز اسے برجن کی یاد دلاتی رہتی۔ یہ خیال دل سے ایک لمحہ کے لیے بھی دور نہ ہوتا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے لطف سے زندگی بسر ہوتی۔ مگر اس خیال کو وہ دور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اور جا پہنچتا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو برجن کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ جذبہ محبت کی طاقت کو دباتے دباتے یہ حال ہو گیا گویا برسوں کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنی تمناؤں کے پورے ہونے کی امید ہو نہ ہو مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالم خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ چھیڑتے ہیں۔ روٹھتے ہیں، مناتے ہیں، انہیں تصورات سے انہیں

تسکین ہوتی ہے اور دل کو ایک پر مزہ اور خوشگوار شغل ہاتھ آ جاتا ہے۔ مگر کاش کوئی طاقت انہیں اس خیالی گلشن کی سیر کرنے سے روکے۔ کاش کوئی طاقت انہیں خیال میں بھی تصویر یار کا دیدار نہ کرنے دے۔ تو ان بدقسمت بندگان محبت کی کیا گت ہو گی۔ پرتاپ انہیں بدقسمت شخصوں میں سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو مسرت بخش خیالات کا لطف اٹھا سکتا تھا۔ عالم خیال کی سیر ظاہری دلچسپیوں سے کم لطف انگیز نہیں ہوتی مگر مشکل تو یہ تھی کہ وہ برجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی تربیت ایسے پاکیزہ اصولوں پر ہوئی تھی اور اسے ایک نیک منش پاک باطن بزرگ کی صحبت سے فیض اٹھانے کے ایسے اچھے موقعے ملے تھے کہ اس کی نگاہوں میں خیالات کی پاکیزگی کی اتنی ہی وقعت تھی جتنی فعلوں کی پاکیزگی کی، یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ برجن کو جسے بارہا بہن کہہ چکا تھا جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا، عالم خیال میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بناتا جو خباثت سے کیسے ہی پاک ہوں مگر نفس سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک منشی سنجیون لال موجود تھے اس کا کچھ نہ کچھ وقت ان کے ساتھ گیان اور معرفت کے چرچوں میں کٹ جاتا تھا جس سے روح کو یک گونہ تشفی ہوتی تھی مگر ان کے چلے جانے کے بعد تربیت نفس کے یہ موقعے بھی جاتے رہے۔

سباما اسے ہر دم دل گرفتہ پاتی تو اسے بہت صدمہ ہوتا۔ ایک روز اس نے کہا! ''تمہاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دنوں کے لیے الہ آباد چلے جاؤ۔ وہاں شاید تمہاری طبیعت بحال ہو جائے'' یہ خیال پرتاپ کے دل میں کئی بار پیدا ہوا تھا مگر اس خوف سے کہ اماں کو تنہائی بہت شاق گزرے گی اس نے کبھی اس تجویز پر غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو ارادہ پختہ ہو گیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہو گیا۔ اب سباما کا یہ حال ہے کہ جب دیکھیے پرتاپ کو پردیس میں

رہنے سہنے کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے راڑ مت مول لینا۔ جھگڑنے کی تو تمہاری ویسے بھی عادت نہیں ہے مگر سمجھائے دیتی ہوں، پردیس کو واسطہ ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرنا۔ تمہاری یہ بڑی بری عادت ہے کہ جاڑوں میں سر شام سے سو جاتے ہو۔ پھر کوئی کھانے کے لیے کتنا ہی جگائے سنتے تک نہیں۔ آپ بھی اپاس کرتے ہو اور دوسروں کو بھی اپاس کراتے ہو۔ یہ عادت پردیس میں بنی رہی تو تمہیں رات کا کھانا کاہے کو میسر ہوگا۔ دن کو ذرا دیر کے لیے آرام کر لیا کرنا۔ تمہاری آنکھوں میں تو دن کو جیسے نیند ہی نہیں رہتی۔ اسے جب موقع ملتا بیٹے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آ پہنچا۔ گاڑی دس بجے دن کو چھوٹتی تھی۔ پرتاپ نے سوچا برجن سے ملاقات کر لوں۔ پردیس جا رہا ہوں پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گدگدایا اور ماں سے کہہ بیٹھا۔ سہاما بہت خوش ہوئی۔ ایک طشت حلوہ اور سموسے اور دو تین قسم کے مربے رکھ کر ردھیا کو دیئے کہ للو کے ساتھ جا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا۔ کپڑے بدلے اور بن سنور کر چلے۔ مگر چلنے کو تو چلے۔ اب جوں جوں قدم آگے اٹھتا دل بیٹھا جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں۔ نہ جانے من میں کیا سمجھے کیا نہ سمجھے۔ چار مہینے گزر گئے اس نے مجھے ایک خط بھی تو الگ نہیں لکھا۔ پھر کیوں کر کہوں کہ میرے ملنے سے اسے خوشی وہ گی۔ اجی اب اسے تمہاری فکر ہی کیا ہے۔ تم مر بھی جاؤ تو وہ آنسو نہ بہائے۔ یہاں کی بات ہی اور تھی۔ وہاں کی بات اور ہے۔ اور مجھے یہ حماقت سوجھی کہ نیا سوٹ پہن کر آیا۔ یہ ضرور اس کی نگاہوں میں کھٹکے گا۔ کہیں یہ نہ سمجھے کہ لالہ جی مجھے رجھانے آئے ہیں۔ اسی حیص و بیص میں بڑھتا چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ شیاما چرن کا مکان نظر آنے لگا۔ اور کملا صحن میں چہل قدمی کرتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی پرتاپ کی وہ کیفیت ہوگئی جو کسی چور کی سپاہی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ فوراً اس مکان کی آڑ میں چھپ گیا اور ردھیا سے بولا تو جا یہ

چیزیں دیتی آمیں ذرا ایک ضرورت سے بازار جا رہا ہوں لوٹتا ہوا آؤں گا، یہ کہہ کر بازار کی طرف چلا۔ مگر دس ہی قدم گیا کہ پھر مہری کو بلایا اور بولا ''مجھے شاید دیر ہو جائے اس لیے ادھر نہ آسکوں گا۔ کچھ پوچھیں تو یہ پرزہ دے دینا'' یہ کہہ کر جیب سے پنسل نکالی اور چند سطریں لکھ کر دے دیں۔ جس سے اس کے قلب کی حالت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے ''میں الہ آباد جا رہا ہوں۔ اب وہیں پڑھوں گا۔ تم سے عجلت کے باعث نہ مل سکا۔ زندہ رہوں گا تو پھر آؤں گا۔ کبھی کبھی اپنی خیر و عافیت سے اطلاع دیتی رہنا'' تمہارا پرتاپ

پرتاپ تو پرزہ دے کر رخصت ہوا اور ردھیا آہستہ آہستہ برجن کے گھر پہنچی۔ وہ اسے دیکھتے ہی دوڑی اور خیر و عافیت پوچھی لالہ کی کوئی چٹھی آئی تھی

ردھیا: ''جب سے گئے چٹھی پتر کچھ نہیں آوا''

برجن: ''چچی تو آرام سے ہیں؟''

ردھیا: ''للو بابو پراگ راج جات ہیں تون تک اداس رہت یں''

برجن: (چونک کر) ''للو پراگ جا رہے ہیں؟''

ردھیا: ''ہاں ہم سب بہت سمجھاوا ہیں کہ پردیس میں کہا جیہو مدا کوؤ کی سنت ہیں''

برجن: ''کب جائیں گے؟''

ردھیا: ''آج دس بجے کے ٹیم سے جویا ہیں۔ تم سے بھینٹ کرن آوت رہے۔ تو ان دوار پر آئے کے لوٹ گئے''

برجن: ''یہاں تک آکے لوٹ گئے۔ دروازہ پر تھا کوئی یا نہیں؟''

ردھیا: ''دوار پر کہاں آئے، سڑک پر سے چلے گئے''

برجن: ''کچھ کہا نہیں کیوں لوٹے جاتا ہوں؟''

ردھیا: ''اتنا بولے کہ ہمارا ٹیم چھوت جیہے ہنوں ہم جانت ہے''

برج رانی نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پریم وتی کے پاس جا کر

بولی، ''اماں للو آج الہ آباد جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ذرا ان سے ملتی آؤں۔ پھر نہ جانے کب ملنا ہو کب نہ ہو۔ مہری کہتی ہے وہ مجھ سے ملنے آئے تھے مگر وہ سڑک کے اسی پار سے لوٹ گئے''

پریم وتی: ''ابھی نہ بال گندھوائے، نہ مانگ بھروائی، نہ کپڑے بدلے اور جانے کو تیار ہو گئیں''

برجن: ''میری اماں جی آج جانے دیجیے، بال وال گندھوانے بیٹھوں تو دس یہیں بج جائیں گے''

پریم وتی: ''اچھا تو جاؤ مگر شام تک لوٹ آنا، گاڑی تیار کرا لو، میری طرف سے سباما کو پالاگن کہہ دینا'' برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی۔ کپڑے بدلے، مادھوری کو باہر دوڑایا کہ گاڑی تیار کرنے کے لیے کہہ آ، تب تک کچھ خیال آیا، ردھیا سے پوچھا'' کچھ چٹھی پتر نہیں دیا؟''

ردھیا نے پرزہ نکال کر دے دیا۔ برجن نے اسے بڑے شوق سے لیا۔ مگر اسے پڑھتے ہی اس کا چہرہ کملا گیا۔ سوچنے لگی وہ دروازہ تک آ کر کیوں لوٹ گئے؟ اور خط بھی لکھا تو ایسا اکھڑا مہمل، چہ خوش! ہم سے عجلت کے باعث نہ مل سکے۔ ایسی کیا عجلت تھی، کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ گاڑیاں جاتی ہوں گی۔ کیا مجھ سے ملنے کے لیے ان سے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت نہ ہو سکی۔ ضرور اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ مجھ سے کونسی خطا ہوئی۔ یکا یک اسے اس وقت کی یاد آئی جب وہ عالم بے قراری میں پرتاپ کے پاس گئی تھی۔ اور اس کی زبان سے نکلا تھا'' للو! مجھ سے کیسے صبر ہو گا؟'' برجن کو اب سے پہلے کئی بار خیال آ چکا تھا کہ میرا اس وقت کا اور اس حالت میں جانا بہت ہی نامناسب تھا۔ اس وقت یقین ہو گیا کہ میں ضرور للو کی نگاہوں میں گر گئی۔ میری محبت اور عزت اب ان کے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی۔ اور مادھوی سے بولی'' کوچبان سے کہہ دے

گاڑی تیار نہ کرے میں نہ جاؤں گی''

15

محبت اور فرض کی کشمکش

جس وقت برج رانی سسرال نہ آئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک ہندو پتی برتا عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار قائم نہ ہوا تھا۔ گھر میں کبھی اس کے شوہر کا ذکر نہ آتا۔ اگر آتا تو کسی ناخوشگوار طریقے پر۔ اس نے استری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر ان کا کوئی دیرپا اور متحرک اثر اس پر نہ ہوا تھا۔ غالباً اسے یہ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑے گا

مگر جب وہ سسرال میں آئی اور اپنے دل و جان کے مالک، اپنے آقا، اپنے شوہر کو ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اس کے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہوئی۔ روشن ہوا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کس طرح اپنا دھرم نباہنا چاہیے۔ اگلی باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جس وقت یاد آ جاتی کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہوئی ہے جس کی تلافی میں نہیں کر سکتی تو وہ خود بخود شرم سے سر جھکا لیتی اور اپنے تئیں کوستی۔ اسے تعجب ہوتا کہ للو کے سامنے جانے کی مجھے کیوں کر جرأت ہوئی۔ شاید اس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تب للو کی شریفانہ صورت اس کے پیش نظر ہو جاتی اور وہ صدق دل سے اسے دعا دیتی۔ روز بروز اس کی محبت اور عظمت دل میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔

لیکن جب آج پرتاپ چند کی تلون مزاجی سے اسے یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ للو اس واقعہ کو بھی بھولا نہیں ہے اور اس کی نگاہوں میں میری عزت وقعت نہیں رہی۔ یہاں تک کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے تو اسے حسرت ناک غصہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت مکدر ہو گئی اور اس کی جو محبت اور عزت دل میں تھی وہ چشم زدن میں پانی کے آبی بخارات کی طرح غائب ہونے لگی۔ عورتیں

انتہائی درجہ کی ذکی الحس ہوتی ہیں وہ جتنی پر دلی اور یکسوئی سے محبت کر سکتی ہیں۔ جس پرتاپ کے لیے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دینے کو تیار تھی وہ اس کے ایک طفلانہ فعل کو بھی درگزر نہیں کر سکتا۔ کیا اس کا دل ایسا تنگ ہے۔ یہ خیال برجن کے دل ہی دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی وہ زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچتی کہ جب پرتاپ مجھے بھول گئے اور میری رتی بھر بھی عزت نہیں کرتے۔ تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کھپاؤں۔ جیسے رام تلسی سے ویسے تلسی رام سے۔ اگر انہیں مجھ سے نفرت ہے۔ اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں تو میں بھی ان کی صورت سے متنفر ہوں اور مجھے بھی ان سے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی اوپر جھنجھلا اٹھتی کہ میں ہر دم انہیں کی بات کیوں سوچا کرتی ہوں کہ اب ان کا خیال بھی دل میں نہ آنے دوں گی۔ مگر ذرا دیر میں خیال پھر اسی طرف جا پہنچتا اور وہی خیالات بے چین کرنے لگتے۔ قلبی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کملا چرن سے خلوص و محبت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ذرا دیر کے لیے کہیں چلا جاتا تو اس سے شکایت کرتی۔ جتنے نقد روپے جمع کر رکھے تھے۔ وہ سب اسے دے دیئے کہ اپنے لیے سونے کی گھڑی اور طلائی چین خریدے۔ کملا نے ذرا انکار کیا تو آب دیدہ ہو گئی۔ وہ یوں ہی اس کا غلام بنا ہوا تھا۔ اب کی محبت کا یہ رنگ دیکھ کر اور بھی جان دینے لگا۔ دوستوں نے سنا تو مبارکبادیں دینے لگے۔ میاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کوسنے لگے کہ ایسی محبتی بیوی ہمیں نہ ملی۔ تمہیں وہ بنا مانگے یوں ہی سرفراز کرتی ہیں اور یہاں بیویوں کی فرمائشوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کانی کوڑی نہ ہو مگر ان کی فرمائشیں ضرور پوری ہونی چاہئیں ورنہ طوفان نوح برپا ہو جائے گا۔ اجی اور کیا کہیں کبھی گھر میں ایک بیڑے پان کے لیے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پانچ الٹی سیدھی سنے بن نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہم کو بھی تمہاری سی بیوی

عطا کرے۔

یہ سب تھا کملا چرن بھی محبت کرتا تھا اور برج رانی بھی محبت کرتی تھی۔ مگر دونوں کے ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے، برجن کے چہرے پر اس کا مطلق نشان نہ تھا۔ روز بروز زرد اور نحیف ہوتی جاتی تھی۔ کملا چرن قسمیں دے کر پوچھتا کہ تم دبلی کیوں ہوئی جاتی ہو۔ اسے خوش رکھنے کی جو تدبیریں بن پڑتیں کرتا۔ یار دوستوں سے بھی اس اہم معاملہ میں مشورہ لیتا مگر کچھ کارگر نہ ہوتا تھا۔ برج رانی ہنس کر کہہ دیا کرتی کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں بالکل اچھی ہوں یہ کہتے کہتے اٹھ کر اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی یا پنکھا جھلنے لگتی۔ ان خاطر داریوں سے کملا چرن پر غموں کا سرور ہو جاتا۔ مگر لکڑی کے اوپر رنگ روغن لگانے سے وہ کیڑا نہیں مرتا جو اندر بیٹھا ہوا ہو۔ اس کا کلیجہ کھائے جاتا ہے۔ یہ خیال کر کے پرتاپ چند مجھے بھول گئے اور میں ان کی نظروں میں گر گئی ناسور کی طرح اس کے کلیجے میں چھید کیا کرتا تھا۔ اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بستر پر سے اٹھنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا علاج ہونے لگا۔

ادھر پرتاپ چند کی طبیعت الہ آباد میں سنبھل چلی تھی۔ ورزش کا تو اسے شوق تھا ہی، وہاں اس کا خوب چرچا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جسمانی ورزش سے بڑھ کر اور کوئی علاج نہیں ہے۔ صبح کو جمناسٹک اور کشتی۔ شام کو کرکٹ اور فٹ بال اور آٹھ نو بجے رات تک باغیچوں کی سیر۔ اتنی محنت کے بعد چارپائی پر گرتا تو سویرے آنکھ کھلتی چھ ہی مہینوں میں کرکٹ اور فٹ بال کا کپتان بن بیٹھا اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کھیلے کے سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔

آج علی گڑھ کی ایک زبردست ٹیم سے ان کا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ یہ ٹیم ہندوستان کی مشہور ٹیموں کو شکست دیتی، فتح کا ڈنکا بجاتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ انہیں

غالباً اپنی فتح کی جانب سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ وہ کئی مضبوط ٹیموں سے پالے مار چکا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی الہ آباد والے مایوس نہ نظر آتے تھے۔ ان کی امیدیں پرتاپ چند سے وابستہ تھیں۔ اگر وہ آدھ گھنٹہ بھی جم گیا، تو رنوں کے انبار لگا دے گا۔ اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر ادھر کا وارا نیارا ہے۔ پرتاپ کو بھی اتنا بڑا میچ کھیلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ کلیجہ بانسوں اچھل رہا تھا کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کھیل شروع ہوا۔ پہلے علی گڑھ کے کھیلنے والوں کی باری آئی اور دو ڈھائی گھنٹوں تک انہوں نے خوب جوہر دکھائے۔ ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علی گڑھ نے 400 رن کیے۔ اب الہ آباد والوں کی باری آئی مگر کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ یقین ہو گیا کہ بے طرح ہار ہے۔ اب عہدہ برا ہونا محال ہے اتنے رن کون کرے گا؟ اکیلے پرتاپ کیا بنا لے گا پہلا کھلاڑی آیا اور تیسرے گیند میں رخصت، دوسرا آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلی ہی گیند میں کیچ ہو گیا۔ چوتھے نے آکر دو تین معرکے کے ہٹ لگائے مگر جم نہ سکا۔ پانچویں صاحب بلاک کرنے میں شہر کا کالج تھے۔ مگر یہاں ان کی بھی کچھ نہ چلی۔ تھاپی رکھتے ہی غائب ہو گئے۔ اب پرتاپ چند متانت سے قدم اٹھاتا، بیٹ گھماتا گھماتا میدان میں آیا۔ طرفین نے تالیاں بجائیں۔ الہ آبادیوں کی کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی۔ ہر شخص کی آنکھیں پرتاپ چند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ دور بیٹھے ہوئے تھے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ پرتاپ سرخرو لوٹے۔ دیوی اور دیوتا یاد کیے جا رہے تھے۔ پہلا گیند آیا پرتاپ نے خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل انچ بھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا وہ بھی خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل ناف تک پہنچ گئے بہت سے آدمی چھتری سنبھال کر گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پتاخے کی آواز آئی اور گیند شہاب ثاقب کی طرف آسمان کو چیرتا ہوا ہٹ پر کھڑے ہونے والے فیلڈر سے سو گز کے فاصلہ پر گرا۔ الہ